(1)

DEPARTMENT OF URDU

Langat Singh College, Muzaffarpur

NAAC Grade – 'A'

(A Constituent unit of B.R.A. Bihar University, Muzaffarpur)

DR. MUSTAFIZ AHAD
Assistant Professor
Mob- 9955722260, 9472079131

Email:- ahadmustafiz@gmail.com
lscollegeprincipal@gmail.com

Ref. No:…………………...   Date :………………………

B.A. Part I Urdu (Hons)

Paper I

Topic - Ghazal goi

Eqbal ki Ghazal goi

14/7/20

B.A. Part I Urdu (Hons)

Paper I

Topic- Eqbal ki first five Ghazal (Bale-jibreel)

ڈاکٹر مستفیض احمد

Dr. Mustafiz Ahmad.
Assistant Professor
Department of Urdu.
L.S. College.

- ڈاکٹر سر محمد علامہ اقبال (1877-1938)
- "بال جبریل" کی ابتدائی پانچ غزلیں
- اردو شاعری میں غزل گوئی کی روایت
- علامہ اقبال بحیثیت شاعر
- علامہ اقبال کی غزل گوئی

(A) — تمہید

→ غزل کا تعارف
→ غزل کا فن
→ غزل کے اجزائے ترکیبی
→ غزل کے چند مشہور شعراء
→ اردو شاعری میں غزل گوئی کی روایت

(B) —

→ علامہ سر محمد اقبال
→ علامہ اقبال کا عہد
→ علامہ اقبال کی شاعری
→ علامہ اقبال کی غزل گوئی.

تمہید :- غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسے بجا طور پر اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اردو میں جب سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اُس وقت سے لیکر اب تک غزل طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنتی رہی۔ لیکن اس کی مقبولیت کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتی ہی گئی۔ اب تو یہ ثابت ہو گیا کہ غزل میں زمانے کے ساتھ بدلنے، ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر طرح کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انہی اسی صلاحیت نے اردو شاعری مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، نظم میں غزل کو امتیاز حاصل ہے۔ غزل صنفِ قصیدہ کی تشبیب سے نکلی ہے لیکن اب یہ باضابطہ ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔

تعارف :- "غزل" صنفِ "قصیدہ" کی تشبیب سے نکلی ہے۔ لیکن اب یہ باضابطہ ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے۔ اس صنف کو غزل کا نام اسی لئے دیا گیا تھا کہ حسن و عشق ہی اس کا موضوع ہوتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور آج غزل میں ہر طرح کے مضمون کو پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ غزل کی ابتدا عرب میں ہوئی وہاں سے یہ ایران پہنچی اور فارسی میں اس نے بہت ترقی کی۔ فارسی ادب کے واسطے یہ اردو میں داخل ہوئی اور خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔

غزل کا فن :-

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے اور عام طور پر دوسرے اشعار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ غزل کے تمام شعر ایک ہی وزن اور ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جسے ہر شعر کے آخر میں دہرایا جائے۔ اس سے پہلے قافیہ ہوتا ہے جس کا آخری حرف یا آخر

کے چند حرف یکساں ہوتے ہیں۔ جیسے دوا، ذرا، ما ہیں، ہیں۔ بعض غزلوں میں قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہوتی ہے۔ بعض میں صرف قافیہ ہوتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ قدیم اور جدید شعراء کے کلام میں ایسی غزلیں بھی مل جاتی ہیں جو مسلسل قطعہ بند ہوتی ہیں اور ایسی غزلیں بھی جن میں ردیف کی مناسبت سے احساس ہوتا ہے کہ پوری غزل میں ایک ہی خیال ہے۔ یا شاعر نے ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ غزل ایک ہمہ گیر صنف سخن ہے عام طور پر اس میں عشق و محبت کی واردات اور کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن اس کا دامن اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں مذہب، اخلاق، تصوف و رندی و سرمستی سے لیکر سیاسی و سماجی خیالات، فلسفیانہ مضامین اور مناظر فطرت کی تعریف و توصیف تک فکر و خیال کا کوئی گوشہ نہیں، جو اس میں بیان نہ کیا گیا ہو۔ اکثر ایک ہی غزل میں مختلف قسم کے مضامین اور خیالات ملتے ہیں۔ غزل کی مخصوص ہیئت اور اس کی معنوی رنگا رنگی پر اکثر اعتراضات کیے گئے ہیں۔

اردو کے قدیم شعراء نے غزل کے روایتی اصولوں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مثلاً یہ کہ غزل میں صرف حسن و عشق کیفیات اور جذبات کا بیان ہونا چاہیئے۔ جیسے زلف کی، ہجر وغم، شوق و حسرت، وغیرہ۔ یا غزل کے الفاظ نرم اور شیریں خوشگوار اور واضح ہونا چاہیئے۔ یا معشوق کے کردار میں غیرت و خودداری کے اوصاف نمایاں ہونا چاہیئے۔ جبکہ لکھنؤ اسکول کی غزل اور جدید غزل میں ان کلاسیکی اور روایتی اصولوں کی کوئی خاص پابندی نظر نہیں آتی۔ دراصل غزل کے فن کا جوہر اس کا ایجاز و اختصار اور اس کی ایمائیت اور رمزیت ہے۔ اسی کی وجہ سے بہت سے بڑے بڑے سماجی اور فلسفیانہ حقائق غزل کے صرف ایک شعر میں ادا کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے غزل کے منفرد اشعار ہر ایک کو آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں۔ اس وصف نے غزل کی شاعری کو روزمرہ زندگی اور تہذیب کا ایک حصہ بنا دیا غزل میں صنائع بدائع کا بھی خاص طور پر التزام کیا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پچیس تک رکھی گئی ہے۔ کسی بھی غزل کے سب سے اچھے شعر کو بیت الغزل یا شاہ بیت کہا جاتا ہے۔

P.100

غزل کے اجزائے ترکیبی

غزل کے اجزائے ترکیبی میں مطلع، حسنِ مطلع، اشعار، مقطع اور بیت الغزل یا شاہ بیت شامل ہیں۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتے ہیں۔ اسی کو مطلع کہتے ہیں۔ جیسے غالب کی غزل کا یہ شعر

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

یہاں الفاظ "ہوا کیا ہے اور دوا کیا ہے" ہم قافیہ اور ہم وزن ہیں۔ اس میں "ہوا" اور "دوا" قافیہ ہے اور "کیا ہے" جو دونوں مصرعوں میں مکرر آئے ردیف ہے۔ ردیف کا معنی ہی مکرر ہے یعنی جو بار بار آئے۔ قافیہ ہم آہنگ الفاظ کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی پیچھے چلنے کے ہیں۔

مطلع کے بعد کا شعر اگر ہم قافیہ اور ہم وزن ہو تو اسے حسنِ مطلع یا مطلع ثانی کہتے ہیں۔ عام طور پر غزل میں شعر کے مطلع کو حسنِ مطلع کہا جاتا ہے۔
اس کے بعد اشعار آتے ہیں۔ اس کے دونوں مصرعے متعلق غزل کی ایک ہی بحر اور وزن میں ہوتے ہیں جس کا آخری مصرعہ ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتا ہے۔ مثلاً

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "ماجرا" قافیہ اور "کیا ہے" ہم وزن یعنی ردیف ہے۔
غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ مثلاً

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یہاں شعر کے پہلے مصرعہ میں اسد اللہ خاں غالب نے اپنا تخلص "غالب" استعمال کیا ہے۔
غزل کے ایک اچھے شعر کو بیت الغزل یا شاہ بیت کہتے ہیں۔

P.T.O

غزل کے چند مشہور شعراء

(1) ولی محمد ولی دکنی
(2) میر تقی میر
(3) خواجہ میر درد
(4) اسد اللہ خاں غالب
(5) حکیم مومن خاں مومن
(6) شیخ امام بخش ناسخ
(7) خواجہ حیدر علی آتش
(8) شاد عظیم آبادی
(9) حسرت موہانی
(10) فانی بدایونی
(11) داغ دہلوی
(12) جگر مرادآبادی
(13) یاس یگانہ چنگیزی
(14) فراق گورکھپوری
(15) علامہ اقبال
(16) ناصر کاظمی
(17) خلیل الرحمن اعظمی
(18) ابن انشا
(19) جمیل مظہری
(20) کلیم عاجز

P.T.O

اردو شاعری میں غزل کی روایت

اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے اور تقریباً تمام شاعروں نے غزلیں کہی ہیں لیکن یہاں صرف صف اول کے غزل گو شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ دکن کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ غزل گو بھی تھا لیکن اس صنف میں جن دکنی شعراء نے خاص طور پر نام پیدا کیا ان میں سراج اور ولی قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند کے شاعر اس شعراء ولی کا کلام دیکھ کر ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جان جاناں کے نام اہم ہیں۔ اس کے بعد غزل کے سنہری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے انفرادی شاعر ہیں۔ میر، سودا، اور درد۔ اس کے بعد دہلی کے اجڑنے پر لکھنؤ میں شاعری کی محفل سجتی ہے۔ یہاں کے شاعروں میں مصحفی، انشا، جرأت، آتش، ناسخ، قابل ذکر ہیں۔ ان کی غزلوں کا انداز شعرائے دہلی کی غزلوں سے مختلف ہے۔ اس کے بعد دہلی میں شعر و شاعری کی محفلیں پھر سے آراستہ ہوتی ہیں۔ غالب، ذوق، اور مومن اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالب نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اور اسے فکر سے آشنا کیا۔ ذوق نے زبان پر زور دیا۔ مومن نے معاملات عشق میں نام حاصل کیا۔ اقبال نے غزل میں فلسفہ پیش کر کے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی۔ ان کے بعد اصغر، فانی، یگانہ، حسرت، جگر، [illegible]، اور [illegible] نے غزل کو فروغ دیا۔ فراق، فیض، جوش، جذبی، خورشید الاسلام، ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، شاذ تمکنت، شہریار، بشیر بدر، ظفر اقبال، احمد مشتاق، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، عادل منصوری، محمد علوی، پرکاش فکری، اظہر نفیس، صہبا اختر، محبوب ہاشمی، منظور [illegible]، بمل کرشن اشک وغیرہ ہیں۔

علامہ سر محمد اقبال

اقبال کے بزرگ کشمیری برہمن تھے اور کشمیر ان کا وطن تھا۔ قبول اسلام کے بعد ان کا خاندان ترک وطن کر کے سیالکوٹ میں آباد ہو گیا۔ یہیں ۹ نومبر 1877ء کو محمد اقبال کی ولادت ہوئی ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور ماں کا نام امام بی بی تھا۔ یہ دونوں بہت تعلیم یافتہ تو نہیں تھے مگر انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت پر بہت توجہ کی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ شاید اسی لئے اقبال کلام پاک کی تلاوت کے بہت شوقین تھے۔ اور بڑی خوش الحانی سے تلاوت کرتے تھے۔

اقبال کی عمر چار سال چار مہینے کی ہوگی تو دینی تعلیم حاصل کرنے کیلئے انہیں مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ شیخ نور محمد کے ایک دوست جو شاہ صاحب کہلاتے تھے اور جن کا نام سید میر حسن تھا، انہوں نے مشورہ دیا کہ اقبال کی تعلیم صرف درس قرآن تک محدود نہیں رہنی چاہیئے تو یہ کام شاہ صاحب کو ہی سونپ دیا گیا۔ اب وہ اردو، فارسی اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں اقبال اسکاچ مشن اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ شاہ صاحب بھی اسی اسکول سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ ان کی صحبت میں اقبال میں شعری ذوق پیدا ہو گیا۔ انہوں نے 1891ء میں مڈل اور 1893ء میں امتیازی حیثیت سے میٹرک پاس کیا۔ یہیں سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بی اے کی ڈگری کیلئے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی کالج سے بی اے کرنے کے بعد انہوں نے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم کے دوران انہیں فلسفے کے پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔

اقبال نے کم عمری ہی میں یعنی میٹرک کرنے سے پہلے ہی روایتی انداز کی شاعری شروع کر دی تھی۔ انہوں نے داغ کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی مگر جلد ہی نئے انداز کی شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں نظمیں پڑھنے کے بعد ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ 1905ء میں انہیں اعلی تعلیم کیلئے انگلستان جانا پڑا۔ 1908ء میں واپس آئے تو وہ بالکل بدلے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے وقف تھی۔

اقبال نے اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں ملازمت کی۔ اس کے بعد وکالت شروع کی۔ وکالت میں وہ بہت کامیاب نہیں ہوئے۔ حکومت برطانیہ نے 1923ء میں "سر" کا خطاب دیا۔

اقبال نے تین شادیاں کیں مگر ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشگوار نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ 10 جنوری 1934ء کو اقبال کو نزلہ ہوا جو انفلوئنزا میں تبدیل ہو گیا۔ پھر آواز بیٹھ گئی۔ دل کا عارضہ بھی ہو گیا۔ مرض بڑھتے گئے۔ صحت خراب رہنے لگی۔ آخر کار 21 اپریل 1938ء کو انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر علامہ اقبال کا عہد

اقبال کائنات اور زندگی میں ارتقا کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنے مطالعہ حیات و کائنات میں اصول ارتقا کو سامنے رکھ کر ہی وہ گتھیاں سلجھائیں جو ان کے زمانے تک عقدۂ لاینحل بنی ہوئی تھیں۔ اقبال کی شاعری میں بھی ارتقا پایا جاتا ہے۔ اور ان کا نظریۂ عشق بھی جس نے ارتقا کی ہر منزل میں ان کی شاعری کا ساتھ دیا ہے۔ اور یہ خودی کا محور ہے۔

اقبال 1877ء میں پیدا ہوئے اور 1938ء میں انتقال کر گئے اس لحاظ سے ان کا عہد نشاۃ الثانیہ کا ہے۔ جہاں چیزیں بدل رہی تھیں، دولت کروٹ لے رہی تھی۔ تہذیب و تمدن کی تشکیل ہو رہی تھی۔ عالمی بیداری میں انسان سانس لے رہا تھا۔ زار کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ اینگلز، مارکس اور لینن کے چرچے ہو رہے تھے۔ جب اسلام زوال پذیر تھا۔ عیسائیت کا دورہ شباب آ رہا تھا۔ انقلاب کے لیے جنگ عظیم اول اور دوسری جنگ عظیم کو علامہ اقبال نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ برطانوی سامراج بہت مضبوط تھی۔ ہندوستان میں اس کے پس پردہ جو تحریک کارفرما تھی وہ دراصل 1857ء کا انقلاب تھا۔ اس کے بعد اسی سے سرسید کی سیاسی اصلاحی تحریک نے بہت زیادہ حصہ لیا۔ جو اب ایک انقلاب اور ذہنی اضطراب ہر دور کی یادگار تھا۔ جس کے عروج و زوال کے بعد انہوں نے ہر پہلو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اردو شاعری بھی اس کی زد میں آ گئی اور سب سے پہلے پنجاب میں آزاد اور حالی نے 1874ء میں اردو کی روایتی شاعری کے خلاف آواز اٹھائی اور بالکل نئے طرز کی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اقبال اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ یہاں یہ کہنا نہیں کہ اقبال کے ذہنی ارتقا میں ان ہی عناصر کارفرما تھے۔

علامہ اقبال کے معاصرین:

اقبال کے معاصرین میں اسماعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، نظم طباطبائی، ریاض خیرآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، یگانہ چنگیزی وغیرہ بہت اہم تھے۔ لیکن ان لوگوں کے بیچ علامہ اقبال کی شاعری ایک تجربہ تھی جس میں عالمی شناخت کا محسوس ہوتا ہے۔

P.T.O

علامہ اقبال کی شاعری ۔

اقبال اردو زبان کے فلسفی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے فلسفے سے ملتِ اسلام کے درد کی دوا کی۔ وہ مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کی بربادی کے اسباب پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بے عملی کا شکار ہیں۔ اور ترکِ دنیا کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیم انہیں فلسفۂ وحدت الوجود نے دی تھی۔ اقبال نے اس کا ازالہ کرنے کیلئے فلسفۂ خودی پیش کیا۔ خودی کا مفہوم ہے خودشناسی اور خودآگہی۔ یعنی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا پتا لگانا اور انہیں نکھارنا۔

جب انسان کو اپنی صلاحیتوں کا علم ہو جائے تو ضرورت ہے کہ وہ انہیں مستحکم کرے۔ استحکامِ خودی کیلئے سب سے اہم چیز ہے "عشق"۔ یعنی کسی مقصد کو حاصل کرنے کی ایسی لگن جیسی عشق کے جذبے میں ہوتی ہے۔ استحکامِ خودی کیلئے دوسری ضروری شرط ہے جہد و عمل، یعنی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مسلسل کوشش۔ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے تقدیر کے بھروسے نہ بیٹھا رہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مایوس نہ ہو اور پُرامید رہے۔ فقر و استغنا سے بھی استحکامِ خودی میں مدد ملتی ہے۔ استحکامِ خودی کی آخری اور سب سے اہم تدبیر یہ ہے کہ مردِ کامل کی پیروی کی جائے۔

خودی کی تکمیل سے انسان مردِ کامل ہو جاتا ہے۔ اس میں صفاتِ الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ "ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ"۔ اس کے آگے بیخودی کی منزل ہے جہاں فرد کی خودی ملت کی خودی میں ضم ہو جاتی ہے۔ یہی خودی کی آخری منزل ہے۔

اقبال پیامی شاعر ہیں لیکن اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ پیرایۂ اظہار میں دلکشی نہ ہو تو فلسفہ و پیغام کی طرف کوئی متوجہ ہوتا ہی نہیں۔ انہوں نے تمام صوری وسائل کا سہارا لیا اور سامعین و قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک تو وہ اپنے پیغام کو کسی اہم ہستی کی زبان سے ادا کر کے زیادہ پُرتاثیر بنا دیتے ہیں۔ کبھی خضر کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ تو کبھی جبرئیل کی، کبھی لینن کی تو کبھی سرسید کی، سعدی یا پیر رومی بھی ان کی نہایت پسندیدہ فکر ہیں۔ ان کا

P ۴۱۵

سارا کلام خوبصورت تصویروں کی ایک گیلری ہے۔ پیکر تراشی میں استعارہ و تشبیہ سے بہت مدد ملتی ہے اور اقبال کو ان دونوں کے استعمال کا بہت سلیقہ ہے۔ شوکت لفظی بہت ضروری ہے۔ اور اقبال کے کلام میں یہ رنگ بہت زیادہ ہے۔ جو حقیقت میں ان کی طبیعت کو بہت مناسبت ہے۔ وہ بحروں کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بھی وہ بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں اور نظموں کو بڑی خوش آہنگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور شے جس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، صنائع کا ہنرمندانہ استعمال ہے۔ اقبال نے مختلف صنعتوں کو بڑے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ سب سے زیادہ استعمال انہوں نے صنعت تلمیح کا کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ علامہ اقبال کی اردو شاعری نہ صرف معاصرین بلکہ ان کے پیش روؤں سے بھی ایک طرح سے بہتر ہے۔ قوم و ملت کے سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنے کا ایک انوکھا اظہار بھی ہے۔ علامہ اقبال کی وجہ سے الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کا خواب پورا ہوا، جنہوں نے شاعری کو افادی اور مقصدی سمجھا تھا۔

علامہ اقبال کی غزل گوئی

اقبال کی غزل کا مطالعہ اگر اصناف سخن کی قسمیات (Typology) کے نقطہ نظر سے کیا جائے تو ہم بعض ایسے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جو ہمیں کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتے، اس لئے کہ اردو غزل کی روایت سے وہ غزل مراد لی جاتی ہے جو اقبال کے لئے نامانوس تھی۔ حالانکہ اقبال کی غزل ہماری روایت سے منحرف ہے۔ اقبال کا انحراف، صرف اتنا تھا کہ جو موضوعات اور لہجہ پرانی غزل میں رائج تھے، لیکن انہیں کبھی عشق کی طرح عام تھا، مثلاً غزل میں عربی فارسی کے الفاظ اور قرآن کے حوالے دینا اقبال کی ایجاد نہیں ہے لیکن ان چیزوں کو احساس یا تجربے کے اظہار کے بجائے فکر کے اظہار کیلئے استعمال کرنا، جو متقدمین کے یہاں کہیں کہیں نظر آتا ہے، اقبال کے یہاں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ بڑے غزل گو کی حیثیت سے اقبال کی شہرت جس کلام پر ہے وہ زیادہ تر ان کا سارا "بال جبریل" میں ہے۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

p ۱۱۵

(1) میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
(2) اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا۔
(3) گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
(4) اثر کرے نہ کرے، سن تو لے مری فریاد
(5) پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
(6) ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
(7) حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

نصاب میں پیش نظر ایک سے لیکر پانچ غزل بال جبریل کے پہلے حصے میں سے لئے ہیں دوسرے حصے میں حصے سے نمبر ہی درج کردیا ہے، اضافی طور سے۔ اصل میں یہ کہنا ہے کہ اقبال کی غزلیں منتشر خیالی سے پاک ہیں، اشعار میں ایسا ربط ہے کہ اگر عنوان لگا دیا جائے تو نظم کہلا سکتی۔ اقبال کی غزل گوئی کا یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ غزل گوئی کی روایت سے انحراف ہے۔ جب شاعر مشق کر رہا ہوتا ہے تو کیفیت جذبہ اور تجربہ [illegible] باہم پیوست کر اٹھاتے ہیں وہ کیسے ممکن ہے کہ مختلف شعر مختلف کیفیت کی ترجمانی کرے۔ اسی طرح اگر دیکھا جائے تو کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف شاعری کہا تھا اسی بنا پر کہ غزل کا شاعر الشان ہوتا ہے اور السان کی زندگی وقت جب کوئی غزل کہے گا تو خیال کی پراگندگی ممکن نہیں، چنانچہ اقبال کی غزل کلیم الدین احمد کی کسوٹی پر کھرا اترتی ہے۔ ان کی غزلوں میں اسلوم سنجیدگی، خودی، بیداری، انسان کی کردار سازی، سیرت سازی اور خودی کے حوالوں پر زیادہ سے زیادہ زور ہے۔ موضوعات کے اس تناظر میں اقبال کے یہاں سوز و ساز، سلاست، تشبیہات و استعارات، تلمیحات اور موسیقیت کا انوکھا امتزاج ملتا ہے۔ اگر کوئی انتخاب سمجھے کہ ان کی غزلوں کی گنگناہٹ میں نغمگی معلوم ہوتا ہے۔ آہنگ اور تیز لہجہ اس قدر کہ ذہنی اعصاب پر غالب ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اشعار

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

محمد بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

بتانا مقصود یہ ہے کہ علامہ اقبال کی غزل فلسفۂ حیات اور مابعد الطبیعات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس تناظر میں انسانی زندگی کی حکمت عملی پر سوالیہ نشان بھی لگاتی ہے۔ اس طرح افکار و تصورات کی نئی دنیا آباد ہے جس سے قاری بھی استفادہ کرتا ہے۔